طاہرہ صدیقہ *

کئی چاند تھے سرِ آسماں — ایک جائزہ

شمس الرحمٰن فاروقی
کئی چاند تھے سرِ آسماں
کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۶ء
صفحات: ۸۳۰

شمس الرحمٰن فاروقی کا ناول کئی چاند تھے سرِ آسماں اس دور کے چند بڑے اور اہم ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس ناول کو انھوں نے انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب اور انسانی و ادبی سروکاروں کا مرقّع قرار دیا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے راجپوتانے سے شروع ہونے والی اور ایک صدی سے کچھ زیادہ عرصہ بعد دلّی کے لال قلعے میں ختم ہونے والی یہ داستان ہندوستانی فنکار کی روح کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرنے کے علاوہ ہند اسلامی تہذیب، ادبی معاشرہ، انگریزی سیاست اور اس کی وجہ سے تہذیب اور تاریخ کے بدلتے ہوئے پیکر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ یہ ناول ہمیں یہ بھی بتلاتا ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے ہند اسلامی معاشرہ میں شاعر، عاشق، فنکار اور عام انسانی زندگی کی جذباتی اور روحانی تکمیل کی تلاش کس طرح اور کن اصولوں کی بنیاد پر کرتے تھے۔ دلّی کی مٹتی ہوئی بادشاہت کے سائے میں پھلنے پھولنے والی اس تہذیب کا منظر نامہ غالب، ذوق، داغ، گھنشیام لال عاصی، امام بخش صہبائی، حکیم احسن اللہ خان وغیرہ بہت سے حقیقی کرداروں سے بھی جگمگا رہا ہے۔ کئی چاند تھے

اس ناول کو تمام ناولوں سے مختلف و منفرد بنانے والی چیز اس کی نہایت عمدہ زبان ہے۔اس ناول کی زبان ایسی ہے کہ ابتدا سے اب تک کسی ناول نگار نے استعمال نہیں کی۔ یہ زبان آج کی زبان نہیں بلکہ اسی زمانے کی ہے جس وقت کے یہ واقعات ہیں۔اس ناول کی زبان، زمان کے ساتھ چلتی ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے کچھ پرانے الفاظ متروک ہوتے جاتے ہیں اور نئے الفاظ داخل ہوتے جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی اچانک نہیں ہوتی، اس لیے اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ ناول کی زبان کب تبدیل ہوگئی۔ یہی نہیں، مکان کی تبدیلی سے اس نئی جگہ اور اس زمانے کے الفاظ تحقیق کر کے استعمال کیے گئے ہیں۔اس کے علاوہ مختلف کرداروں کے علم و ہنر کے اعتبار سے بھی تکنیکی الفاظ تلاش کر لیے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ کردار اگر مکان بدلتا ہے اور دوسری نئی جگہ پڑاؤ ڈالتا ہے تو وہاں کے الفاظ اور اس کے اپنے الفاظ پہلے ملے جلے، اور بعد میں صرف نئی جگہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔سیّد ارشاد حیدر اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں:

> ۸۳۰صفحات پر پھیلے ہوئے اس ناول میں ہزاروں الفاظ کی تحقیق کر کے ایک نئی زبان بنا کر اسے تخلیقی زبان میں منتقل کیا گیا ہے اور پورا ناول اسی زبان میں تخلیق کیا گیا ہے۔۔۔ناول کی زبان با محاورہ اور رواں ہے لیکن بار بار لغت دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔۔۔بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو لغت میں بھی نہیں ملتے۔۔۔اغلب کہ یہ الفاظ اس مخصوص طبقے کی عام بول چال کے رہے ہوں گے۔ بہر حال یہ تو طے ہے کہ الفاظ کی عمیق تحقیق کے بعد ان سے ایک نئی زبان بنانا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔(۱)

ناول کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ قاری کی دلچسپی لگاتار برقرار رہے اور یہ تجسّس رہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ابتدائی پچاس ساٹھ صفحات میں مصنّف نے وزیر بیگم کے اسلاف کا شجرہ بیان کیا ہے۔جس میں ان کی زندگی کے مختصر حالات ہیں، جو ناول کی اصل کہانی سے کم دلچسپ نہیں۔شجرہ وزیر خانم کے دادا کے باپ میاں عرف مخصوص اللہ سے شروع ہوتا ہے۔ میاں مخصوص

سر آسمان کو اگر اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب میں قومی یک جہتی، زندگی، محبت اور فن کی تلاش کی داستان کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ناول کے تمام کردار تاریخی ہیں اور اپنے اصل ناموں کے ساتھ مخصوص تاریخوں میں اپنے مخصوص مقامات پر، اپنے اپنے علم و ہنر کے اعتبار سے اپنے تکنیکی لفظوں سے ترتیب دی ہوئی اُسی زمانے کی زبان بولتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں۔ناول کے مرکزی کردار ''وزیر خانم'' مغلیہ سلطنت کے ٹوٹتے ہوئے اقتدار کی علامت کے طور پر اور ''ولیم فریزر'' انگریزی حکومت کے جبر اور اقتدار کی علامت کے طور پر لائے گئے ہیں۔لیکن اس کے بقیہ سبھی کردار علامتی نہیں ہیں۔اس ناول میں کہیں کہیں داستانی رنگ بھی نمایاں ہے۔ مکالمے انتہائی جاندار اور دلکش ہیں۔منظر نگاری ایسی ہے کہ جیسے کوئی آرٹ فلم نظروں کے سامنے چل رہی ہو یعنی پورا عہد زندہ کر دیا گیا ہے۔ناول کے فن اور اس کی اب تک کی تاریخ کو دھیان میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فاروقی صاحب نے تکنیک کا ایسا استعمال کیا ہے کہ یہ ''مرقع'' جدید نظر آئے۔مثلاً پہلے باب کی سرخی یوں دی گئی ہے: ''وزیر خانم (ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی، ماہر امراض چشم کی یاداشتوں سے)''۔

اور پھر یہ سلسلہ سلیم جعفر، شمیم جعفر اور وسیم جعفر تک آتا ہے۔گو کہ یہ صحافیانہ سی غیر ضروری تفصیلات ہیں لیکن جیسے ہی اس میں ان دستاویزات کا تذکرہ ہوا جو وسیم جعفر نے مرنے سے پہلے خلیل اصغر فاروقی کو فراہم کر دی تھیں تاکہ وزیر خانم کے بارے میں تحقیق کی جاسکے تو قصے میں جان پڑ جاتی ہے۔وسیم جعفر اس ماہ لقا کی تصویر مرزا فخرو کے روزنامچے سے پہلے ہی نکال چکے تھے تاکہ برٹش لائبریرین کو پتا نہ چل سکے۔خلیل اصغر فاروقی اور وسیم جعفر کی گفتگو کئی موضوعات کا احاطہ کرتی ہے اور خاصی دلچسپ ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے اس ناول سے ایک ویژن برآمد کیا ہے۔اس ویژن کا تعلق اس ٹریجڈی یا المیے سے ہے جس سے وزیر خانم اپنی چار شادیوں کے دوران گزری۔ چنانچہ ان کے نزدیک ناول کا عنوان ''وزیر خانم کا عظیم المیہ'' ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا (حوالے کے لیے دیکھیے حاشیہ (۳))۔ناول کا عنوان بے حد خوبصورت ہے جو کہ احمد مشتاق کے ایک خوبصورت شعر کا مصرع اولیٰ ہے۔اور یوں لگتا ہے کہ ناول کا پورا قصہ نہ صرف وزیر خانم کے المیہ بلکہ اُس پورے عہد کے مجموعی المیہ سے تعلق رکھتا ہے۔

اللہ کشن گڑھ کے شبیہہ ساز تھے جنھوں نے ایک ایسی تصویر بنائی جس کی شبیہہ والا جاہ گجندر پتی مرزا عرف مہاراول کی چھوٹی بیٹی من موہنی (یا سترھویں صدی کے ایک والی کشن گڑھ کی محبوب ملکہ ''بنی ٹھنی'' کی تصویر یا کشن گڑھ کی رادھا) کی شبیہہ جیسی تھی۔ من موہنی کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ ستر پردوں میں رکھی جاتی تھی۔ میاں نے اس کی تصویر کیسے بنائی اس کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ مہاراول جب یہ تصویر دیکھتا ہے کہ من موہنی بے چادر و جوتی، ناک، ہاتھ، پاؤں زیور سے عاری اور پاؤں میں بیڑی کے ساتھ بے پردہ مجافے میں ہے تو اس واقعے کو مصنف نے کس دلچسپ انداز میں انجام تک پہنچایا۔ وہ اپنی بیٹی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ من موہنی میری طرف دیکھ:

> تو میری بیٹی، میں والا جاہ گجندر پتی مرزا ترا باپ، میں نے تجھے اس لیے تو پیدا نہ کیا تھا کہ تو مجھے رسوا کرے۔ یہ تیری تصویر یہاں کہاں سے آئی؟ کس نے تجھے دیکھا اور کس نے اسے اتنی جرأت بخشی کہ وہ تیری شبیہہ کو میرے پہلو میں زخم دامن دار بنا دے اور پھر تیرے نام کو لوگ یوں اچھالیں کہ وہ زمین آسمان میں شہاب ثاقب کی طرح سب کے لیے مفت نظر بن جائے؟... (۲)

من موہنی خاموش رہی اور چند ہی ثانیوں میں اس کے باپ نے اس کی گردن اڑا دی کیونکہ اس کی تصویر نے اس کے باپ کی عزت کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اور اس تصویر کو گھوڑے کے سموں تلے پامال کر دیا۔ یہ تو معلوم نہیں کہ میاں نے موہنی کو اصل میں دیکھا تھا یا یہ محض اس کا تخیّل تھی لیکن وہ اس پامال تصویر کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا اور ہمیشہ گم سم رہتا تھا۔ مرتے وقت یہ تصویر اس کے پاس سے برآمد ہوئی۔ میاں نے کشمیر کی جانب ہجرت کی، وہیں شادی کی اور پھر ان کی اولاد کشمیر سے فرخ آباد (ہندوستان) کی طرف آ گئی۔ یہ تصویر ناول میں بار بار آتی ہے یہاں تک کہ میاں کی چوتھی نسل میں محمد یوسف سادہ کار کی تیسری بیٹی وزیر خانم (۱۸۱۱ء) پیدا ہوتی ہے جو ہو بہو من موہنی کی شبیہہ ہے۔ لیکن یہ من موہنی سے بالکل مختلف ہے۔ یہ انگریزوں کے زمانے کی بالکل آزاد خیال، خود مختار اور اپنی تقدیر کا

خود فیصلہ کرنے والی خاتون ہے جو ایک انگریز مارسٹن بلیک سے بغیر نکاح کے منسلک ہو جاتی ہے اور ایک بیٹے اور ایک بیٹی کو جنم دیتی ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان وزیر خانم کے کردار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> لگتا ہے اس کا ملکوتی حسن، اس کا مخصوص ذہن یا سوچ کہ وہ مردوں پر راج کرنے کے لیے تخلیق کی گئی ہے اور اس کی آسمان کو چھوتی ہوئی آرزومندی سب کا اجتماع اس کے عمل میں ڈھل کر قلوپطرہ اور دوسری کئی تاریخی خواتین کی طرح آخری منظر میں زوال اور شکست سے دوچار کرتا ہے۔ (۳)

شادی کے بارے میں اس کے زرّیں خیالات ملاحظہ کیجیے۔ وہ اس زمانے کے اعتبار سے اس امر پر راضی نظر آتی ہے کہ تعلق وہ اچھا جسے توڑا جا سکے۔ اسے اپنے آپ اور تقدیر پر اتنا بھروسا ہے کہ کہتی ہے کہ شاہزادہ اگر نصیب میں ہے تو ضرور آئے گا۔ ورنہ مجھے جو مرد چاہے گا اسے چکھوں گی، پسند آئے گا تو رکھوں گی نہیں تو نکال باہر کروں گی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ ابھی زیادہ عمر کی نہیں تھی اور زندگی کے میدان میں عقل، ذہانت اور فطانت کے جو بڑے قد و قامت کے گھوڑے دوڑا رہی تھی ان کی گرد کو شاید پچاسی نوے برس کی خاتون بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔

وزیر خانم جیسے باغیانہ خیالات رکھنے والی خواتین ہو سکتا ہے کہ ہر زمانے میں ملیں لیکن وزیر خانم کا تو کوئی جواب نہیں ملتا۔ ایک ایسے زمانے میں جب عورت کو پاؤں کی جوتی تصور کیا جاتا تھا، ان کی معاشرے میں کوئی عزت نہیں تھی، اس نے اپنے حق میں آواز اٹھائی کہ وہ خود کو ان رسموں اور رواجوں کی بھینٹ نہیں چڑھنے دے گی۔ وہ خود کو کسی طرح مردوں سے کمتر نہیں سمجھتی اس کا کہنا ہے کہ اگر میں عورت ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ خدا نے مجھے عورت ذات بنایا ہے تو اس نے میرے اندر کچھ خوبیاں اور صلاحیتیں بھی رکھ دی ہیں جن سے اگر میں کچھ کام نہ لوں تو یہ اللہ کی مرضی کے خلاف ہو گا۔

مارسٹن بلیک کے مارے جانے کے بعد اس کے دونوں بچے بلیک کی بہن نے چھین لیے اور ظاہر ہے کہ وہ عیسائی بنا دیے گئے۔ ایک ماں سے اس کے بچے چھین لیے جائیں کیا یہ کسی ایسے

سے کم ہے؟ پھر جائیداد کا حقدار نہ ہونا۔ دوسرا المیہ یہ تھا کہ شادی نہ ہوئی تھی اگر ہوئی ہوتی اور رجسٹر ہو جاتی تو بلیک کی جائیداد سے اسے بڑا حصہ ملتا۔ وہ اکیلی دہلی میں رہنے لگی اور اپنے ماضی کو یاد کرتی رہتی اور مرد کے راج کو کوستی رہتی۔ ناول سے اس ضمن میں ایک اقتباس دیکھیے:

> اس دنیا میں مرد ہی مرد ہیں انہیں کا راج ہے انھیں کا راج۔ ہم لوگوں کو تو بس ہے کہ انھیں جہاں تک ہو سکے اپنی مٹھی میں کیے رکھیں ـــ اور پھر میرے بچوں، میرے جگر بند امیر مرزا (بیٹا) اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک (بادشاہ بیگم) کا کیا ہوگا؟ (۴)

لیکن بے مائیگی، مایوسی اور اداسی کا یہ عرصہ طویل نہیں تھا۔ وہ نواب شمس الدین احمد سے منسلک ہوگئی اسی وقت ولیم فریزر کی نظر بھی وزیر خانم پر تھی لیکن اسے ناکام ہونا پڑا۔ نتیجے کے طور پر اس نے شمس الدین کو نیچا دکھانا اور وزیر خانم کی توہین کرنا شروع کر دی۔ عاجز آ کر شمس الدین اپنے ایک آدمی کریم خاں سے فریزر کا قتل کرا دیتے ہیں۔ لیکن وہ بالآخر تفتیش میں پکڑے گئے اور انھیں پھانسی کی سزا ہوگئی۔ وزیر خانم کے شمس الدین سے ایک بیٹا پیدا ہوا نواب مرزا جو بڑا ہو کر داغ دہلوی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے بعد وزیر خانم تیسرے مرد آغا مرزا تراب علی کے نکاح میں آ جاتی ہے۔ مرزا تراب علی کا بھی ٹھگوں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے۔ ٹھگی کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور سیاسی تاریخ میں بھی انگریزوں کا اس خوفناک اور دردناک نظام کے خلاف ایکشن موجود ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ٹھگوں کی آغا مرزا تراب علی کے خلاف واردات کی جس انداز سے عکاسی کی ہے اسے لرزہ خیز ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے دستاویزی رجحان کے تحت ان کے خاندان، ان کے تربیتی نظام، ان کے شادی بیاہ کی روایات اور رسوم کا حال بیان کیا ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ لوگ ایک طویل عرصے سے جاری ظالمانہ پیشے سے متعلق تھے جہاں ندامت کا کوئی گزر نہ تھا۔ بہر حال مرزا تراب علی مارے جاتے ہیں اور وزیر خانم پھر بے سہارا ہو جاتی ہے اور چوتھے مرد مرزا فخرو ولی عہد (مرزا

محمد سلطان فتح الملک شاہ بہادر عرف مرزا غلام فخرالدین) کی بیوی بن کر قلعے میں ''شوکت محل'' کا خطاب پاتی ہیں۔ لیکن مرزا فخرو کی فطری موت (۱۸۵۶ء) ہو جاتی ہے اور وزیر خانم قلعے سے بے دخل کر دی جاتی ہیں۔ اور پھر ہمیشہ کے لیے بے سہارا ہو جاتی ہیں۔ چاروں شوہروں سے انھیں ترکہ میں کچھ نہیں ملا اور دہلی سے رام پور کا (جہاں ان کی منجھلی بہن تھیں)، سفر کرتی ہیں۔ ناول یہاں ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کے قریب ختم ہو جاتا ہے۔

ناول میں شروع سے آخر تک ایک تجسّس اور تسلسل برقرار رہتا ہے۔ فرضی کرداروں کے مزاج اور خط و خال واضح کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ تاریخی کرداروں کے مزاج اور خط و خال بیان کرنا۔ مصنّف نے کردار سازی میں ایک مصوّر جیسا کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے لفظوں کے ذریعے وہ مصوّری کی ہے کہ کردار کے مزاج، خط و خال، لباس اور ان کی زبان، ان کی جسمانی حرکات وغیرہ اس قدر واضح ہو گئے ہیں جیسے کہ وہ ہمارے سامنے موجود ہوں۔ جبکہ مصنّف کے سامنے محض رونما ہونے والے یا تصور میں لائے گئے واقعات ہیں۔ ان واقعات کی روشنی میں کردار کا مزاج، اس کی زبان، اس کا لہجہ، اس کی آرائش کیسی ہوگی، اس تصور کو سامنے رکھ کر ایک مصور کی طرح تصویر بنائی گئی ہے۔ مصور بھی صرف تصویر بناتا ہے لیکن مصنّف نے تو کہیں کہیں تصویر کو جاندار انسان بنا دیا ہے۔ 'بنی ٹھنی' کی تصویر کی اتنی عمدہ عکاسی کی ہے کہ وہ زندہ عورت لگتی ہے:

> کاسنی رنگ کی کامدار ساری، پلّو سے سر ڈھکا ہوا، لیکن ساری اس قدر باریک تھی کہ سر کا ایک ایک بال، مانگ میں چنی ہوئی افشاں کے ذرّے، ماتھے کے جھومر میں جڑے ہوئے یاقوت، ہیرے، گومید اور تامڑے صاف جھلکتے تھے۔ کھلا ہوا گندمی رنگ، منہ پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ کی شفق اور مصور اس قدر مشتاق تھا کہ مسکراہٹ کی وجہ سے کانوں کی لوؤں کی سرخی اور خفیف سا کھنچاؤ تک دکھائی دیتا تھا بلکہ محسوس ہوتا تھا ـــ اس وقت تو یہ لگتا تھا کہ کوئی پری شہزادی دل کے سنگھاسن پر بیٹھی ہوئی دنیا کی تمام حسینوں پر

راج کر رہی ہے۔ پوری شبیہ پر ٹھہراؤ اور سکون کی کیفیت تھی گویا پری اپنی مرضی سے آئینے میں اتر آئی ہو اور آئینہ اسے آغوش میں لے کر سو گیا ہو۔ (۵)

اس ناول کے تمام کرداروں کے مزاج اور خط وخال کی نہایت عمدگی سے عکاسی کی گئی ہے۔ لیکن مصنّف نے وزیر خانم کے کردار پر اپنی پوری قوت صرف کر دی ہے۔ اس لیے بھی کہ یہ ناول کا مرکزی کردار ہے اور اس لیے بھی کہ یہ کردار مغلیہ سلطنت کی گرتی ہوئی ساکھ کی علامت کے طور پر لایا گیا ہے جس پر انگریزوں نے اپنے پنجے گاڑھنے شروع کر دیے ہیں۔ وزیر خانم کے کردار کا بیان اس لیے بھی مشکل ہے کہ وہ ہند اسلامی تہذیب کی علامت بھی ہے جو انگریزوں کی چمک دمک سے متاثر ہے۔ اسی لیے وہ اکثر کشمکش میں بھی مبتلا رہتی ہے لیکن اس کا ہر فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا ہے۔ وہ خود ہی سوال کرتی ہے، خود ہی اس کا جواب تلاش کرتی ہے اور خود ہی اپنے آخری فیصلے پر پہنچتی ہے۔ اسی کردار کی آرائش میں مصنّف نے اپنا پورا زورِ قلم صرف کر دیا ہے ایسا کہ یہ کردار ناول کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یادگار بن گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تاریخ میں بھی جہاں اس کے نقوش دھندلے تھے، انھیں اجاگر کر دیا ہے۔ اس ناول کی اشاعت کے بعد اب وزیر خانم ایک غیر معمولی خاتون ہے جو ادبی ذوق بھی رکھتی ہے اور نہ صرف یہ کہ اسے اردو اور فارسی کے بہت سے اشعار یاد ہیں بلکہ وہ خود بھی شعر کہتی ہے۔ مصنّف کے مطابق اگر وہ محنت کرتی اور دل لگا کر کہتی تو شعر گوئی میں ماہ لقا بائی چندا سے کم نہ ہوتی۔ مصنّف نے اس کا نام 'زہرہ' تحریر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زہرہ نامی ایک شاعرہ اس زمانے میں تھی اور وہ شاہ نصیر کی شاگردہ بھی تھی۔ جیسا کہ ناول کی کردار وزیر خانم المتخلّص بہ زہرہ کے بارے میں ہمیں بتایا گیا ہے۔ مصنّف نے دو تاریخی کرداروں کو ایک کر دیا ہے۔ گفتگو میں بھی اشعار کا جواب اشعار ہی سے دیتی ہے، مصنّف نے وزیر خانم کا سراپا ناول میں کئی جگہ مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ایک جگہ تین صفحات میں یہ سراپا بیان ہوا ہے (۶) جس میں خط وخال تو دور کی بات ہے کپڑوں کی شکنیں تک نظر آتی ہیں۔ چند سطور ملاحظہ کیجیے:

وزیر خانم اس دن ترکی وضع کے کپڑے پہنے تھی۔ پاؤں میں آسمان رنگ کا شانی مخمل اور پوست آہوگ کی نکے دار شیرازی جوتیاں، بہت پتلی ایڑی اور لمبی دوڑ، دیوار بالکل نہ تھی ایڑیاں کھلی ہوئی تھیں۔ جوتیوں کی نوکیں بھی شکر خورے کی چونچ کی طرح بہت لمبی اور اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں اور ان کے سرے پر جنگلی مرغے کے سرخ بیر بہوٹی جیسے پر کے طرے تھے، جوتیوں کے حاشیوں پر باریک بیل تھی جس میں سفید اور سنہرے پکھراج ٹکے ہوئے تھے۔ آدمی جوتیوں کی چھب دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے۔ (۷)

ناول میں داستانی رنگ بھی ہے مثلاً ''کتاب'' عنوان کے تحت ص۴۵ سے۵۴ تک یہ باب ڈاکٹر وسیم جعفر کی تحریرات پر مبنی ہے۔ ایک بھیگی ہوئی کتاب وسیم جعفر کے بستر پر اپنے آپ بند ہو جاتی ہے، جیسے کوئی خفیہ ہاتھ اسے وہاں لا کر رکھ گیا ہو۔ یہ کتاب اپنے آپ کھل جاتی اور کبھی اپنے آپ بند ہو جاتی تھی۔ انھیں لگتا تھا کہ کوئی پیچھے سے سرگوشی میں کچھ کہہ رہا ہے لیکن دراصل کوئی ہے نہیں۔ وہ کیا کہتا ہے اس کی زبان سمجھ نہیں آتی۔ یہ وقعہ دس صفحات میں بالکل داستانی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح مہاراول کی آمد کے منظر (۸) میں بھی کچھ کچھ داستانی رنگ جھلکتا ہے۔

ناول میں جا بجا فارسی اور اردو کے اشعار بہت برمحل اور برجستہ آئے ہیں۔ مرزا غالب، پھر ذوق، مومن حکیم احسن اللہ خاں، امام بخش صہبائی، داغ دہلوی اور مرزا فتح الملک بہادر کے ذکر کے ساتھ فارسی اور اردو کے اشعار جا بجا تحریر کیے ہیں۔ کہیں کہیں مکالمے میں بھی اشعار میں سوال جواب کے طور پر تحریر کیے گئے ہیں۔ ان اشعار نے ناول کی ادبی فضا کو اور بھی نفیس ولطیف کر دیا ہے۔

اس ناول میں ایسی بے شمار جزئیات اور تفاصیل ہیں جو کہ قارئین کو حیرت زدہ کر دیتی ہیں۔ اس لیے کہ ان تفصیلات سے شمس الرحمٰن فاروقی کی گہری معلومات اور واقفیت کا پتا چلتا ہے جو ان کے یہاں متعلقہ صورتحال کے حقیقت پسندانہ اظہار سے ظاہر ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر اس کی ساتویں دہائی تک نوابوں کا رہن سہن، ان کے لباس کی تراش خراش، تہذیبی رکھ رکھاؤ، مشاعروں کی محفل میں شعرا حضرات کا احترام، انواع و اقسام

کے کھانے، ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں پر رسوم و رواج، نوابوں کی نگرانی میں کام کرنے والی ملازماؤں اور ان کی نوجوان لڑکیوں کے رویے، نوابوں کی ان پر عنایات، بے نکاحی خواتین یعنی کنیزوں کے ساتھ ان کا طرزِ عمل، ان کی بہادری و ہیکڑی، انگریزوں کی زندگی، ان کے فاسقانہ خیالات اور نوآبادیاتی طرزِ عمل اس دور کے معروف خیالاتِ عامہ جس کے تحت خواتین کو بغیر نکاح کے رکھنے پر معاشرے کے کانوں پر جوں کا نہ رینگنا، ایسے افراد کی بہتات جو نوابوں اور جاگیرداروں کو اِس امر کی اطلاع دیتے تھے کہ فلاں فلاں خاتون کنواری ہے۔ لہٰذا ان سے یا ان کے ولیوں سے رابطہ کرنا تاکہ وہ کسی نہ کسی طرح ان کے گھروں کی زینت بن جائیں۔ خود بادشاہِ وقت کے صاحبزادے مرزا فخرو کو کہیں سے اطلاع ملی کہ وزیر خانم نام کی حسین وجمیل، عالم و فاضل، شاعرانہ مزاج کی حامل بیوہ دلّی میں موجود ہے جس سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔

مرزا تراب علی کی انتہائی افسوسناک موت اور ان کی بہنوں کے خراب سلوک اور شاہ آغا کو ہتھیانے کے امکان کے پس منظر میں داغ کی اٹھتی ہوئی جوانی اور ان کے بہتر مستقبل کے پیشِ نظر وزیر خانم کا یہ دلیرانہ فیصلہ قابلِ تعریف ہی گردانا جائے گا۔ پھر دلّی کے شاہی قلعے کے ماحول میں اس کے دیرینہ ایمبیشن کے پھر سے توانا ہونے کا بھی امکان تھا۔ شمس الرحمٰن نے قلعے کے اندرونی ماحول کا بھی قابلِ تعریف نقشہ کھینچا ہے اور شاید ہی کوئی تفصیل تشنہ چھوڑی ہو۔ یہاں تک کہ اس دور میں پانی کی سپلائی کے ایک نئے نظام تک کا تذکرہ ہے جو خودکار طریقے سے اوپر کی منزلوں میں آجاتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی قلعے کا کلچر ایسا تھا جس سے قاری نابلد تھا۔ مثال کے طور پر بادشاہ کے سامنے مخصوص اوقات میں شہزادگان اور ان کی بیگمات کا پیش ہونا، ان کی ان کے لیے شفقت، کئی مسائل یا امور پر مشورے اور فیصلے... ان تمام جزئیات کی عکاسی سے ناول میں وہ تمام عہد زندہ ہو گیا ہے۔ اور ایک فلم کی طرح قاری کے ذہن کے پردے پر نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانے کی گھریلو اشیا کے مخصوص ناموں اور مروّجہ اصلاحات کی نشاندہی جو کہ اب متروک ہیں ان کے لیے جمالیاتی اور مطالعاتی مسرّت کا سبب بنتی ہیں۔ ظاہر

ہے کہ مصنّف نے اس عہد کے بارے میں دستاویزات کے تحت بہت مطالعہ کیا ہے تب کہیں جاکر اپنے اس فکشن کے ''مرقّع'' میں سمویا ہے۔ کچھ کتب کی نشاندہی تو انھوں نے خود آخر میں کی ہے۔

وزیر خانم کے الم انگیز انجام کے حوالے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرزا فخرو سے اس کی شادی بہت خوش قسمتی کا باعث بنی کہ انھوں نے نہ صرف اس سے محبّت کی اور شوہر کا پیار دیا بلکہ داغ اور شاہ آغا کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر بھی کماحقہ دھیان دیا۔ لیکن چونکہ المیہ کا سایہ اس کے ساتھ ساتھ غیر محسوس طور پر چل رہا تھا اور اس کی تقدیر اس پر زندگی کے ڈرامے کے آخری ایکٹ کو اختتام تک پہنچانے کے لیے بے تاب تھی تو یہ ہوا کہ مرزا فخرو بیماری کے باعث چل بسے۔ وہ سمجھی کہ اب بقیہ زندگی قلعے میں بیوگی میں گزار پائے گی مگر ملکہ نے اسے وہاں سے انتہائی توہین انداز میں رخصت ہونے پر مجبور کر دیا۔ وزیر خانم جو گفتگو کی ملکہ تھی اور اپنے دلائل سے اب تک اپنے ہر مخالف کو ہراتی آئی تھی، لاچار ہو گئی۔ جب اسے کوچ کا حکم ملا تو کوچ کا منظر بھی الم انگیز ہے:

> اگلے دن مغرب کے بعد قلعہ مبارک کے لاہوری دروازے سے ایک چھوٹا سا قافلہ باہر نکلا۔ ایک پالکی میں وزیر، ایک بہل پر اس کا اثاث البیت، اور پالکی کے دائیں بائیں گھوڑوں پر نواب مرزا خان اور خورشید مرزا۔۔۔ پالکی کے بھاری پردوں کے پیچھے چادر میں لپٹی اور سر کو جھکائے بیٹھی وزیر خانم کو کچھ نظر نہ آتا تھا۔ (۹)

وزیر خانم اب کٹی ہوئی پتنگ کی مانند تھی جسے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تاریک حال اور تاریک مستقبل، ذہن میں اب تک کی گزاری ہوئی زندگی کی، جس میں خوشیوں اور مسرتوں کے ساتھ المیے بھی جڑے ہوئے تھے، بازیافت۔ ابتدا سے اب تک پالی ہوئی آرزومندیوں کے شعلے ماند پڑ چکے تھے۔ ڈاکٹر شاہین مفتی اس ضمن میں لکھتی ہیں:

مصنّف اگر چاہتا تو اس نیم تاریخی تمثیلچے کو بہت آگے تک لے جا سکتا تھا جیسا کہ آغاز کے چند ابواب میں جدید طرزِ زندگی اور نئے رشتوں کے کچھ اشارے موجود ہیں لیکن اس کی اختیاری کہانی کا زمانہ ۱۸۵۷ء کے انحطاط اور پسپائی تک ہی اپنی لکیر کھینچ چکا ہے اور کہانی کا بنیادی کردار وزیر خانم محل سراؤں سے نکل کر گلی کوچوں میں اپنے اچھے دن تلاش کر رہا ہے جیسا کہ ناول کے سرورق کی تانیثی تصویر یا شبیہہ ظاہر کر رہی ہے۔ یہ صرف ایک ہی عورت کی کہانی ہے جس نے مختلف مقامات پر اپنا کردار نبھاتے ہوئے سارے معاملات کو نازک اور نہ نظر آنے والے رشتوں میں جکڑ دیا ہے۔ (۱۰)

یہ ناول چونکہ ابھی حال ہی میں شائع ہوا ہے، اس لیے اس کے بارے میں ابھی فکشن کے چند ہی اہم ناقدین کی تحریریں سامنے آئی ہیں۔ انتظار حسین اس ناول کے بارے میں رقمطراز ہیں:

مدتوں بعد ایسا ناول آیا ہے جس نے ہندو پاک کی ادبی دنیا میں ہلچل مچا دی ہے۔ کیا اس کا مقابلہ اس ہلچل سے کیا جائے جو 'امراؤ جان ادا' نے اپنے وقت میں پیدا کی تھی؟ اور یہ ناول ایک ایسے شخص کے قلم سے ہے جسے اول اول ہم نقاد اور محقق کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بطور ناول نگار خود کو منکشف کیا ہے اور محقق فاروقی یہاں پر ناول نگار فاروقی کو پوری پوری کمک پہنچا رہا ہے۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ تحقیق و تنقید اور تخلیق کا کوئی ساتھ نہیں۔ لیکن زیرِ نظر ناول کو اس بات کی جسے قاعدہ کلی کے طور پر دیکھا گیا ہے، استثنائی صورت سمجھنا چاہیے۔ یہاں ہم تاریخ کو تخلیقی طور پر فکشن کے روپ میں ڈھلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ (۱۱)

لہٰذا کئی چاند تھے سرِ آسماں کچھ الگ طرح کا ناول ہے بے شک یہ تاریخ کے ایک عہد کے عالمانہ مطالعے کی پیداوار ہے۔

ناول میں صرف ایک کردار ایسا ہے جو حقیقی اور تاریخی ہے لیکن جس کے بارے میں ہم صرف دھندلے طور پر کچھ جانتے تھے۔ یہ کردار وزیر خانم نامی خاتون کا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی کردار نگاری کے طفیل وہ اب جا کر اپنے پورے رنگ و آہنگ کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے وزیر خانم کی زندگی کو اس درجہ لطافت، نزاکت اور باریک جزئیات کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ ہمارے سامنے ایک پوری تہذیب جسے ہندو مسلم تہذیب کہیے اور اس کے آخری دنوں میں اس کی چمک دمک اور برگ و بار کا پورا نقشہ آ جاتا ہے اور وزیر خانم کا کردار بھی کیا کردار ہے کہ وہ تنہا اپنی ذات ہی میں اس تہذیب کا مجسم وجود معلوم ہوتی ہے۔

ممکن ہے کہ انتظار حسین کو اس ناول اور امراؤ جان ادا کی ہلچل میں کوئی مماثلت نظر آئی ہو کیونکہ کوئی بھی غیر معمولی چیز غیر متوقع طور پر سامنے آتی ہے تو ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ناول کی ہلچل ایک نئی تخلیقی زبان کی ہلچل ہے اور وزیر خانم کی کردار سازی کی ہلچل ہے اور یہ ہلچل اردو ناول کی تاریخ میں نئے انداز کے تہذیبی فکشن کی بنیاد ڈالنے کی ہلچل ہے۔ ممکن ہے کہ ایک وجہ یہ بھی ہو کہ شمس الرحمٰن فاروقی اس دور کے بڑے ناقد ہیں اور اب تک کسی بڑے ناقد نے کوئی بڑا ناول تحریر نہیں کیا۔ فاروقی صاحب سے بھی کسی تنقیدی مجموعے کی توقع اردو والوں کو تھی لیکن غیر متوقع طور پر ایسا ناول سامنے آ گیا۔

بے شک اس ناول میں اتنے محاسن ہیں کہ اس پر ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اس ناول کی بدولت نواب مرزا خان داغ دہلوی کی زندگی پر جو پردے پڑے ہوئے تھے وہ بھی فکشن کے توسّط سے اٹھا دیے گئے ہیں اور اب ان کو صحیح تناظر میں دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔